بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی کتاب "امہات الامہ" پر تبصرہ کرتے وقت ہم نے ان مضامین سے قصداً کوئی بحث نہیں کی جو کتاب کی ابتدا میں بطور مقدمہ درج کیے گئے ہیں، اس لیے کہ ان میں کتاب کے حسن و قبح پر کوئی بے لاگ علمی تنقید نہ تھی، بلکہ ان "مولویوں" پر جوابی لعن وطعن کیا گیا تھا جنہوں نے اس کتاب کی پہلی اشاعت کے وقت مصنف پر لعن وطعن کیا تھا۔ جب ہم نے دیکھا کہ "مولویوں" پر تنگ نظری تعصب اور بے انصافی کا الزام رکھنے والے خود بھی اسی حال میں مبتلا ہیں، اور ان کے ساتھ ایک ہی سطح پر کھڑے ہو کر لین دین کر رہے ہیں، تو ہم کو یہی مناسب نظر آیا کہ کتاب کے مخالفین اور موافقین دونوں کی تحریروں کو نظر انداز کر کے نفس کتاب ہی تک اپنے تبصرے کو محدود رکھیں۔ لیکن اب یہ بات ہمارے علم میں لائی گئی ہے کہ ان تمہیدی مضامین میں سے ایک (جس کے لکھنے والے مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو و استاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ ہیں) دراصل حیات النذیر کے مقدمہ کا ایک ٹکڑا ہے اور جامعہ عثمانیہ کی بی۔ اے کلاس کے نصاب درس میں شامل ہے۔ اس علم کے بعد ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ان خیالات پر بھی تنقید کریں جو پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب نے "امہات الامہ" کے متعلق ظاہر فرمائے ہیں، اس لیے کہ اگر نصاب تعلیم کے واسطے سے اس قسم کے خیالات کو ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کے دماغوں میں اترنے کا موقع دیا جائے، اور پھر انہی خیالات کی روشنی میں امہات الامہ جیسی کتابیں اس کی نظروں سے گذرنے لگیں تو اندیشہ ہے کہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں سے اپنی قوم کے اکابر اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے احترام کا وہ جذبہ رخصت ہو جائے گا جس کا موجود رہنا ہر قوم

میں خودداری اور عزت نفس کے بقا اور اطاعت احکام دینی کے لیے ضروری ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے مقدمہ حیات النذیر میں امہات الامہ پر اظہار خیال کا آغاز اس انداز سے کیا ہے کہ علماء کی طرف سے اس کتاب کی مخالفت میں جو کچھ کہا گیا وہ گویا سب کا سب حسد کی بنا پر تھا ورنہ دراصل کتاب میں کوئی برائی نہ تھی۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمۂ قرآن کو جو مقبولیت نصیب ہوئی تھی، دراصل اس پر علماء ان سے "جلے بیٹھے تھے"، اور چاہتے تھے کہ کسی صورت سے ان کے ترجمے کی طرف سے لوگ بدگمان ہو جائیں، اور "ہمارا ترجمہ بکنے لگے" اس لیے جب امہات الامہ شائع ہوئی تو "ان کی بن آئی"۔ اور انھوں نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کتاب کو ایک بہانہ بنالیا۔

کسی معاملہ کو پیش کرنے کا یہ انداز سراسر وکیلانہ ہے جس طرح ایک وکیل اپنے موکل کے مقدمہ کو پیش کرتا ہے، اسی طرح مولوی عبدالحق صاحب نے مولوی نذیر احمد صاحب کے معاملہ کو پیش کیا ہے۔ اگر وہ ایک بے لاگ نقاد ہوتے تو واقعات کو اس طرح توڑ مروڑ کر بیان نہ کرتے۔ واقعہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنی کتاب میں حضرت فاطمہ، حضرت عائشہ، حضرت علی، حضرت عمر، حضرت عثمان، اور بزرگان اہل بیت پر جو چوٹیں کی تھیں ان پر بالعموم تمام ان مسلمانوں میں ہیجان برپا ہو گیا تھا جن کے دلوں میں اپنے بزرگان دین کے احترام کا جذبہ موجود تھا۔ ان میں صرف پرانے مولوی ہی نہ تھے بلکہ نئے تعلیم یافتہ بھی تھے مثلاً سر اس وقت شیخ عبدالقادر اور مولانا (اس وقت مسٹر) محمد علی مرحوم جنہوں نے کوئی ترجمہ قرآن شائع نہ کیا تھا، اور جن پر یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مولوی نذیر احمد صاحب سے حسد رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں چونکہ مرحوم کے خلاف ایک عام ناراضی پھیل گئی تھی اس لیے بعض وہ لوگ بھی طعن و تشنیع کی آوازیں بلند کرنے میں شریک ہو گئے جو فی الواقع اپنی ذاتی اغراض کے لیے مرحوم سے حسد رکھتے تھے۔ پس واقعہ تو یہ ہے کہ مخالفت کرنے والوں میں چند افراد کے سوا سب کے سب وہ تھے جو نیک نیتی کے ساتھ کتاب کو قابل ملامت سمجھتے تھے لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے

اس واقعہ کو یہ شکل دے دی مخالفین میں اکثر و بیشتر حاسد تھے بلکہ مخالفت کی بنا ہی حسد پر قائم ہوئی تھی۔ کیا اس کو آزادی تنقید نگاری کہا جا سکتا ہے ؟ مولوی عبد الحق صاحب نے بدنیتی کا جو الزام علماء پر لگایا ہے افسوس ہے کہ واقعات کو غلط صورت میں بیان کرنے کی وجہ سے وہ خود ان کی طرف عائد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جس شخص کا مقصد محض امر واقعہ کا اظہار ہو، اور جو انصاف کے ساتھ کسی چیز کے حسن و قبح کو بیان کرنا چاہتا ہو اسے کبھی یہ ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ واقعات کو بدل کر اپنے حسب منشا نتائج نکالنے کی کوشش کرے

اپنے ناظرین کے ذہن میں امہات الامہ کی طرف ایک ہمدردانہ رجحان پیدا کرنے، اور مخالفین کی طرف سے ان کو پوری طرح بدگمان کر چکنے کے بعد مولوی عبد الحق صاحب فرماتے ہیں:۔

لیکن سب سے حیرت انگیز اور عبرت ناک واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلماء کا جو اجلاس دلی میں ہوا اس میں علمائے کرام تو موجود ہی تھے۔ انہوں نے باہم "مسکوٹ" کر کے امہات الامہ کی تمام جلدوں کو جو ابتدائی طوفان کے بعد شہر کے بعض معززین نے مولنا کی منت سماجت کر کے ایک صاحب کے پاس رکھوا دی تھیں اور بکری موقوف کرا دی تھی، منگوائیں اور اپنے سامنے ان کتابوں کا ڈھیر لگوایا، اور ان میں سے ایک مولوی نے زیادہ تر ثواب کمانے کے لئے آگے بڑھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کہہ کے آگ لگا دی۔ اس کے شعلوں کی روشنی مولویوں کے مقدس چہروں پر پڑ رہی تھی اور ان کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اس خوفناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا جو ایک خونخوار درندے یا سنگ دل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو مولانائے مرحوم بھی اسی آگ میں جھونک دیے جاتے۔ یہ منظر قابل دید تھا۔ مولویوں کا یہ حلقہ قرون وسطیٰ کے ان پادریوں کی یاد دلاتا تھا جنہوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بے گناہ زندہ دہکتی آگ میں جھونک دیے کڑکڑاتے تیل کے کڑاہوں میں ڈال دیے

گلوں میں پتھر باندھ کر بہتے دریاؤں میں ڈبو دیے کتوں سے پھڑوا دیے اور طرح طرح کے عذاب دے دے کر اور عجیب و غریب شکنجوں میں کس کس کو سسکا سسکا کر مار ڈالے۔ اور ان کے سامنے راکھ کا ڈھیر ایک تودۂ عبرت تھا جو بیسویں صدی عیسوی کے روشن زمانے کی ایک یادگار تھا۔ یہ راکھ اس قابل تھی کہ اس کی ایک ایک چٹکی بطور یادگار کے شیشیوں میں بند کر کے رکھ لی جاتی تاکہ آیندہ نسلیں اسے سامنے رکھ کر ان علمائے کرام و مصلحان ملک و ملت کی ارواح پاک پر فاتحہ دلاتیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتیں۔ اس رات گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوسِ مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمالناموں میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجاتِ اُخروی کا باعث ہوگی۔ یہ ان بزرگواروں کا کام ہے جنہوں نے چشم بد دور مسلمانوں کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کا بیڑا اٹھایا ہے"۔

اس عبارت کو جو شخص پڑھے گا وہ یہ سمجھے گا کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے چودھویں پندرھویں صدی عیسوی کے اہل حکمت کی طرح تحقیق علمی و اکتشاف حکمی کا کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا جس کو پوپ صفت تاریک خیال، قدامت پرست ملاؤں نے اپنے مزعومات کے خلاف پا کر شور محشر بلند کر دیا اور اپنے جہل و تنگ نظری کی بنا پر اس کو نذر آتش کر کے دنیا کو علمی تحقیق کے اس بیش قیمت ثمر سے محروم کر دیا!

کیا فی الواقع "اُمہات الامۃ" ایسی ہی چیز تھی؟ اگر نہ تھی اور یقیناً نہیں تھی، تو اس کے جلائے جانے کا حال اس پرجوش خطیبانہ انداز میں بیان کرنا کیا معنی؟ "اُمہات الامۃ" کو پیش نظر رکھ کر جو شخص اس عبارت کا مطالعہ کرے گا وہ لامحالہ اس نتیجہ تک پہنچے گا کہ لکھنے والے کے دل میں علماء کے خلاف جو جذبۂ نفرت دوسری وجوہ کی بنا پر پہلے سے موجود تھا وہ ہر اس فعل پر بھڑک اٹھنے کے لیے مستعد تھا جو علماء سے سرزد ہو عام اس سے کہ بجائے خود جائز ہو یا ناجائز۔ بالفاظ دیگر اس جذبۂ نفرت کی شدت نے ذہن کو صحیح و غلط کے درمیان امتیاز کرنے اور افعال کو نفس فعل کی حیثیت سے جانچ کر اس کے متعلق منصفانہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت باقی نہ رکھی تھی، اور اس کے نزدیک مولوی کا فعل محض اس لئے کہ وہ مولوی کا فعل ہے، ہر قسم کی ملامت اور لعن طعن کا

مستوجب تھا اسی کو تعصب کہتے ہیں یہی تنگ نظری اور تاریک خیالی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس پر موجودہ زمانہ کے روشن خیال حضرات پرانے مولویوں کو مطعون کرتے ہیں نہ معلوم یہ کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ روشن خیالی وسعت نظر اور بے تعصبی ایک مخصوص گروہ کے لوازم ذات میں سے ہیں، حتی کہ اگر اس گروہ سے برعکس صفات کا بھی ظہور ہو تب بھی وہ روشن خیال، وسیع النظر اور بے تعصب ہی رہے گا۔ انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کا اظہار جس سے بھی ہو اس کو تنگ نظر اور متعصب سمجھا جائے، خواہ وہ مساجد کے حجروں میں درس دینے والا ہو یا کالجوں میں لکچر دینے والا۔

علماء اگر اپنی حد جائز سے تجاوز کر کے کسی معاملہ میں ناروا شدت برتیں تو بلاشبہ اس پر انھیں ملامت کی جا سکتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کسی دوسرے گروہ کی ایسی ہی غلط روش پر کی جا سکتی ہے۔ اس معاملہ میں قابل لحاظ چیز نفس فعل کی نوعیت ہے، نہ کہ فاعل کی ذات۔ اور ملامت کی مقدار متعین کرنے میں بھی فعل کی نوعیت کا لحاظ ہونا چاہیے نہ کہ فاعل کی ذات کا لیکن بدقسمتی سے یہاں تو جدید و قدیم کی جنگ چھڑی ہوئی ہے اور انصاف پر فریقانہ تعصب (Party feeling) غالب آگیا ہے۔ ایک گروہ نے اپنے مخالف گروہ کو "فرقہ ملائیہ" قرار دے لیا ہے، اور یہ سمجھ لیا ہے کہ اس کی ہر بات پر ملامت کرنا، طنز و تعریض کے تیر برسانا، پھبتیاں کسنا، اور تمام ممکن طریقوں سے اس کو ذلیل کرنا ہمارا حق ہے، اور اس کام میں ہم جس قدر زیادہ مبالغہ کریں، اسی قدر زیادہ ہماری "روشن خیالی" کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی مخصوص اصطلاح کے لحاظ سے یہ "روشن خیالی" ہو۔ مگر عقل و خرد کی نگاہ میں تو یہ ایک دوسری قسم کی "پاپائیت" اور "ملائیت" ہے جو پرانی پاپائیت و ملائیت کے بالمقابل وجود میں آرہی ہے۔ اور درحقیقت اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ان "روشن خیالوں" کو کسی تاریک خیال ملا کے مقابلہ میں ممتاز کرتی ہو۔ ایک انتہا درجہ کے تنگ نظر ملا سے جس ذہنیت کا ظہور ہوتا ہے، وہی ہم کو یہاں بھی نظر آتی ہے۔ وہ بھی فرقہ بندی کرتا ہے۔ یہ بھی کرتے ہیں۔ وہ پرانی زبان میں گالیاں دیتا ہے۔ یہ نئی زبان میں دیتے ہیں۔ وہ کفر و فسق کے

فتوے لاتا ہے۔ یہ اس کے جواب میں زمانۂ وسطیٰ کے پادریوں سے اس کو تشبیہ دیتے ہیں جو ان کے نزدیک اسی پایہ کی تذلیل ہے جس پایہ کی تذلیل ملا کے نزدیک کسی کو کافر و فاسق قرار دینا ہے۔ غرض انصاف نہ اس کے پاس ہے نہ ان کے پاس عقل ہے نہ وہ کام لیتا ہے، نہ یہ پھر آخر وہ کونسی چیز ہے جس کی بنا پر یہ ملاؤں کے مقابلہ میں فضیلت کا دعویٰ کرسکتے ہیں محض خانقاہ اور کالج کا فرق تو کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔

یہ فریقانہ تعصب ہی ہے جس کی بدولت علماء کے گروہ سے وہ حقوق بھی سلب کرلیے گئے ہیں جو ہر گروہ اور ہر شخص کے جائز حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے باپ دادا کو گالیاں دی جائیں اور وہ اس پر غضب ناک ہو تو اس کا غصہ حق بجانب۔ اگر کسی قوم کے اسلاف کی توہین کی جائے اور وہ اس پر ناراض ہو تو اس کی ناراضی جائز۔ اگر کسی حکومت کے خلاف تحقیر آمیز خیالات ظاہر کیے جائیں اور وہ اس پر مقدمہ چلا دے تو بر حق حتیٰ کہ اگر انجمن ترقی اردو کے معاملات پر کوئی مخالفانہ اظہارِ رائے کرے اور مولوی عبدالحق صاحب کو اس پر غصہ آئے تو وہ بھی روا لیکن اگر اصحاب و اہل بیت رسولؐ کی سیرتوں پر توہین آمیز طریقہ سے نکتہ چینی کی جائے، اور رکیک زبان میں ان کے حالات بیان کیے جائیں تو مولویوں کو یہ حق نہیں کہ اس پر غضب ناک ہوں وہ صداقت اور نیک نیتی کے ساتھ کسی ایسی کتاب پر غضبناک ہو ہی نہیں سکتے۔ ان کے جذبۂ غضب میں رشک و حسد کے عناصر کی جستجو کرنا اور نہ پائے جائیں تو ایجاد کرلینا ضروری۔ وہ اگر اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو "جلسے پھپولے" پھوڑتے ہیں۔ اگر اس کے سدباب کا مشورہ کرتے ہیں تو "سکوٹ" کرتے ہیں۔ اگر اس کو جلا دیتے ہیں تو اس الزام کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں جو کتب خانۂ اسکندریہ کے معاملہ میں دشمنان اسلام نے حضرت عمرؓ کے سر تھوپا ہے!

مولوی عبدالحق صاحب نے کتاب کے جلائے جانے کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس سے ایک ناواقف آدمی یہ گمان کرے گا کہ علماء نے شدت غیظ میں یہ کوئی مجنونانہ حرکت کی تھی لیکن واقعہ جس طرح پیش آیا اس کی کیفیت مولوی حبیب الرحمن خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ سابق صدر الصدور امور مذہبی، حیدر آباد) کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ کتاب کی اشاعت کے بعد بعض اہل فہم کے سمجھانے بجھانے سے خود مؤلف مرحوم کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا اور انہوں نے اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی جس کو اب میں واپس لیتا ہوں۔ اس بنیاد پر انھوں نے تمام نسخ رسالۂ مذکور کے، (جو ان کے پاس موجود تھے) ان صاحب کے سپرد کر دیے جن کے سامنے اعتراف کیا تھا جو رسالے شائع ہو چکے تھے (ان کی تعداد ۹۰ تھی) ان کی فہرست دے دی اور اپنی طرف سے اجازت دیدی کہ وہ خریداران سے (اگر کہیں ہوں) واپس لے لیے جائیں۔ یہ بھی خواہش کی کہ ان کے اعتراف کا مسلمانوں کے کسی مجمع عام میں اعلان کیا جائے (مثلاً جمع کو جامع مسجد میں) اور تمام رسالے تلف کر دیے جائیں" (الناظر لکھنؤ مورخہ جنوری ۱۹۱۶ء بحوالہ "صدق" مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۵ء)۔

پھر مقدمات عبدالحق کے مقدمہ میں شروانی صاحب اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ ندوۃ العلماء کے ارکان و شرکاء آخر وقت تک "امہات الامہ" کو جلانے پر آمادہ نہ تھے مگر مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور نے خود جلانے پر اصرار کیا اور انہی کے زور دینے پر کتاب جلائی گئی۔ مقدمۂ مقدمات عبدالحق ص۔)۔

ایک معتبر گواہ کا یہ بیان پڑھیے، اور اس کے بعد پھر ایک نظر مولوی عبدالحق صاحب کی اس عبارت پر ڈالیے جس میں "امہات الامہ" کے ڈھیر پر مٹی کا تیل چھڑکنے اور آگ لگانے والے مولویوں کو زنانہ وطنی کے پادریوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔